ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

Vol. 5, No.2
(2021)

جنوبی پنجاب میں دریائے چناب کے کنارے آباد لوگوں کا زبانی ادب

(لوک کہانیاں، لوک گیت، کہاوتیں اور پہلیاں)

*ڈاکٹر سجاد نعیم

**اقراء الماس

***جویریہ ظفر

****محمد اویس

Abstract:

Folk culture is the specific reference and identity of any region. people living in a particular community have affinity with each other and with their land. They want to introduce this treasure to their future generations. But due to moderannization and complexity in culture mostly the priorities, needs and inclinations of the new generation are different from their traditional culture. This is mainly due to the transformation of the world into a global village which has strengthened the concept of virtual reality and therefore, the local traditions are influenced up to a great extent. There are some communitiee in South Punjab that has revive their centuries old traditions with them. They see the new life through the eyes of the past and want to live in their own romance. The article under review examines the folk tales, folk songs, proverbs and legends of the people living on the banks of the river Chenab. This article also clarifies the folk wisdom of these people. The author is also publishing a book titled "Chenab Kanare" in which the lives of the people living along the Chenab bank have been reviewed in detail. Hopefully it will be published soon.

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

** ایسوسی ایٹ لیکچرار، شعبہ سوشیالوجی، دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

*** اسکالر، شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

**** اسکالر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

سرزمین پنجاب پر بہنے والے پانچ دریائوں میں دریائے چناب بھی شامل ہے۔ یہ دریا تاریخی اور رومانوی حوالوں سے شہرت کا حامل ہے مگر ابھی تک اس دریا کے حوالے سے مربوط معلومات سامنے نہیں آئیں۔ مختلف کتابوں میں چناب کے بارے میں معلومات ٹکڑوں کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ دریا960 کلو میٹر کی مسافت طے کرتا ہوا دریائے سندھ سے جاملتا ہے۔ کوہِ ہمالیہ سے نکلنے والی دو ندیاں چندرا اور بھاگا مل کر دریائے چناب بناتی ہیں گویا کوہِ ہمالیہ سے دریائے چناب کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہ دریا دوندیوں چندرا اور بھاگا کے ملنے سے بنتا ہے جو لاہل برالاچہ (Lahaul Baralacha) کے نزدیک سے نکلتی ہیں۔ چندرا اور بھاگا ملنے کے بعد دریا چمبا میں پنگی اور کشمیر کے جنوب مشرق کی طرف سے بہتا ہے۔ ۱۲۴۵ سے پہلے جہلم، چناب اور راوی ملتان کے نزدیک ایک ہی جگہ پر ملتے تھے۔ ملتان سے ۴۵ کلو میٹر جنوب میں اُچ کے مشرق کی طرف بیاس سے ملتے تھے لیکن چودھویں صدی کے اختتام تک چناب نے اپنا راستہ تبدیل کر کے ملتان کے مغرب کی طرف سے بہنا شروع کر دیا جو آج تک ہے۔ ایم ایس کرشنا اس بارے میں کہتے ہیں:

"Before the year 1245 A.D The Jhelum, Chenab and Ravi joined near Multan, flouring just east of that Place, and then joined the Beas east of Uch, 45 Km South of Multan, but by the end of the fourteenth century the Chenab had changed its course to the one which it now occupies to the west of Multan." [۱]

جب کہ سیّد اولاد علی گیلانی دریائے چناب کے رستے کی تبدیلی کے متعلق کہتے ہیں:

"دریائے چناب کے متعلق بھی یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ قدیم زمانے میں وہ اپنے موجودہ محل وقوع کے مشرق میں کئی میل اُس طرف بہتا ہو۔ ۱۲۴۵ء کے قریب زمانے میں یہ پتا چلتا ہے کہ اُس وقت شہر ملتان چناب کے مغرب میں واقع تھا۔"[۲]

دریائے چناب کے نام کے ماخذ کے حوالے سے قدیم روایت یہ بھی ہے کہ اس کے سوتے چین سے پھوٹتے ہیں اس لیے اس کا نام چناب رکھا گیا۔ اس لیے اس کو "چائنا دریا (China River)" بھی کہا جاتا ہے۔

"The Chenab (more properly Chinab or river of China) is the Asikni of the Vedas and the Akesines of the Greek historians."[۳]

چناب سنسکرت کے لفظ "چندرابھاگا" سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے چاند کی منزل والا۔ آئینِ اکبری میں چندر بھاگا سے موسوم کیا گیا ہے۔ علامہ ابو الفضل لکھتے ہیں:

"اس صوبے (صوبہ ملتان) میں چھ دریا بہتے ہیں۔ پرگنہ شور کے قریب دریائے بھت، دریائے چندر بھاگا (چناب) سے آملتا ہے اور یہاں سے ستائیس کوس بہتا ظفرپور کے قریب دریائے راوی میں مل جاتا ہے اور یہاں تینوں دریا ایک دھار بن کر ساٹھ کوس بہتے ہوئے اوچ کے قریب دریائے سندھ میں گرتے ہیں۔ ظفرپور سے بارہ کوس ادھر دریائے بیاس اور ستلج کا سنگم ہے اور اس سنگم کے بعد دریا ہرھاری اور دندوزنی وغیرہ کے ناموں سے مشہور ہے۔"[۴]

جب کہ ٹالمی (Ptolemy) نے اسے سندابالس (Sandabalis) کا نام دیا ہے۔ دریائے چناب پہاڑی سلسلوں سے گزرتے ہوئے بعض مقامات پر "جانڈابالا" اور کہیں "شانتر" کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔[۵]

"In its course through Himalayas the River (Chenab) is called Chandara Bhaga which means 'proceeding from the moon".[۶]

اگزان کی تصنیف "ویدک ہند" سے پتہ چلتا ہے کہ چناب کا ویدک نام "آسیکنی" اور "چندر بھاگ" ہے۔ ایم ایس کرشنا نے "جیالوجی آف انڈیا اینڈ برما" کے صفحہ ۲۰ پر اس کا سنسکرتی نام آسیکنی (Asikni) اور چندر بھاگا (Chandarbhaga) لکھا ہے اور تقریباً آج سے سات سو سال قبل اسے "نین چاندل" بھی کہتے تھے۔ اس سلسلے میں میر مزاری شاعر کہتا ہے:

نین چاندل ہے آپے سکے
راوی اساں سکاواں گے

نندولال دیو کی مرتب کردہ ڈکشنری "The Geographical Dictionary of Ancient and Mediaeval India" میں جناب کے جو قدیم نام بتلائے گئے ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

Asikni - The river Chenab (Page 12)

Acesines - The river Chenab in the Punjab, it is the corruption of Asikni. (Page 1)

Chandrabhaga - The Chenab (Page 47)

Chandrika - The river Chenab (Page 47)

Marudvridha - The Chandrabhaga (Chenab) Page 127

Sita - The river Chandrabhaga (Chenab) Page 187[۷]

مرزا ابنِ حنیف دریاؤں کے قدیم ناموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"جن دریائوں کا ذکر رگ وید میں سب سے زیادہ آیا ہے۔ ان میں دریائے سندہو(سندھ) سرسوتی(موجودہ ہاکڑہ، گھگر) درشدوتی، شتدری(ستلج)، وپاس(بیاس) پروشنی(راوی) اسکنی(چناب) وتستا(جہلم) شامل ہیں۔۔۔۔رگ وید کا بیشتر حصہ آج سے ساڑھے تین ہزار سے لے کر تین ہزار برس قبل یعنی ۱۵۰۰ ق۔م تا ۱۰۰۰ کے بین بین مختلف شاعروں نے تخلیق کیا۔"[۸]

مزید لکھتے ہیں:

"اس طرح پاکستان کے دوسرے مشہور اور بڑے دریائوں کو رگ وید میں سندہو (سندھ) وتاستا(وتستا۔جہلم) اشکنی(اسکنی۔چناب) پروشنی (راوی) وپاس(بیاس) شتدری(سوتودری۔ستلج) اور سرسوتی (موجودہ ہاکڑہ، گھگر) کہا گیا ہے۔ راوی کو بعد کے زمانوں میں ایراوتی بیاس کو ویاسا اور چناب کو چندر بھاگ اور سندو بھاگ بھی کہتے تھے۔ آریائی دور کے بہت بعد یونانیوں نے دریائے راوی کو ہائیڈریٹس، بیاس کو ہائیفاسس اور ستلج کو "زارڈرس یاسائی ڈرس" سندھ کو انڈس، جہلم کو ہائیڈارسپس اور چناب کو اکسائنس کہا۔"[۹]

دریائے چناب کا اساطیری نام "چندرآب" ہے۔

"چندرآب دریائے چناب کا قدیم اور اساطیری نام ہے۔"[۱۰]

جب کہ قدیم یونانی اسے Acesines کے نام سے پکارتے تھے۔ چندر بھاگ کا مشہور چینی سیاح ہیون سانگ بھی ذکر کرتا ہے۔ چندر بھاگ اور جہلم کا سنگم اٹھارہ ہزاری کے پاس ہے۔ یونانیوں نے اس علاقے کا نام ساندوفاکس یعنی سکندرخور رکھا تھا۔ البیرونی نے کتاب الہند میں اس کا نام "چندربھاگ" اور "دریائے جندراہ" تحریر کیا ہے[۱۲]۔ دریائے چناب شروع ہی سے رومانوی شہرت رکھتا آیا ہے، اس لیے ویدک دَور میں چندر بھاگ یعنی چاند بھاگ یعنی چاند کی قسمت والا رکھا گیا کیونکہ قدیم یونان میں چاند دیوی (Diana) خوبصورتی اور رومان کی علامت تھی۔

لوک کہانیاں:

قصہ گوئی کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان البتہ ان کہانیوں کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتنی پرانی ہیں کیونکہ یہ کہانیاں صدیوں کا سفر طے کر کے آج صفحہ قرطاس پر منتقل ہو رہی ہیں۔ یقیناً یہ کہانیاں کسی ایک ذہن نے تخلیق نہیں کی ہوں گی بلکہ یہ کئی ادوار اور مراحل میں مکمل ہوئی ہوں گی۔ ان کہانیوں کے کردار اور زبان مختلف زمانوں میں مختلف رہے ہوں گے اور یہ کہانیاں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہوں گی۔ گویا ان کہانیوں کا ایک مصنف نہیں اور شاید دنیا کا کوئی ادب بھی لوک کہانیوں کے مصنف کا کھوج نہیں لگا سکتا۔

لوک کہانیوں کے بارے میں ایک قیاس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوک کہانیاں محض، خیالی، بے مقصد اور مافوق الفطرت قصے ہوتے ہیں جن کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر ایسے کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کہانیاں اس وقت کہی گئی ہوں گی جب انسانی زندگی فکری اور ذہنی طور پر ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی ہو گی۔

یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ ان کہانیوں میں تاریخ اور سماجیات کے وہ عوامل مکمل طور پر نہیں ملتے جن کی ہم توقع کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس دور کا انسان کئی قسم کے توہمات میں گرفتار تھا۔ بہت سی حقیقتوں کی اپنے طور پر تاویلیں تلاش کرتا تھا۔ اس لیے ایسے میں ان کہانیوں میں مکمل سماجی اور تاریخی رویوں کو تلاش کرنا آسان کام نہیں مگر پھر بھی ان کہانیوں میں کہیں نہ کہیں اس خطے کی ثقافت اور جغرافیائی خدوخال نظر آتے ہیں۔ ان کہانیوں کے کرداروں کے نام بھی اسی خطے سے مناسبت رکھتے ہیں۔

لوک کہانیوں میں نہ صرف غیر حقیقی اور خیالی دنیا ہوتی ہے بلکہ یہ کہانیاں ہمیں قدیم لوگوں کی سوچ، ان کے ادبی رجحانات ان کے خیالات، روایات، رسم ورواج، رہن سہن، توہمات، خواہشات اور خوف کے بارے میں بھی بتاتی ہیں۔

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ بعض کہانیوں کے کرداروں کے ناموں ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ کہانی کس قسم کی ہو گی۔ اسی طرح جب اکثر کہانیاں شروع ہوتی ہیں تو پہلے جملے ہی سے سننے والا مان لیتا ہے کہ اس میں معاشرے کی اونچ نیچ، عروج وزوال اور بے کسی کا ماجرا بیان کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر "ایک تھا بادشاہ اور اس کی اولاد نہ تھی۔" اب اس میں سننے والا جان لیتا ہے کہ کسی غیبی طاقت سے بادشاہ کی اولاد پیدا ہو گی اور وہاں سے کہانی آگے چلے گی۔ لوک ادب کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ سینہ بہ سینہ سفر کرتے ہوئے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا ہے۔ ہزاروں سال سے یہی عمل جاری ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ قوموں کے میل جول سے بھی ایک قوم کی روایات دوسری قوم میں منتقل ہو جاتی ہیں چونکہ لوک ادب سارے انسانوں کا ادب ہے۔ اس لیے اس میں دوسری قوموں کی روایات کا منتقل ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

جدا جدا رسم ورواج سے بھی کہانیوں میں تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ مقامات بدل جاتے ہیں۔ کہانیوں کی منظر نگاری میں مقامی جغرافیے کو دخل ہو جاتا ہے۔ بعض کہانی سنانے والے اپنی مہارت سے کئی کہانیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں کہ وہ ایک ہی کہانی دکھائی دیتی ہے۔ کہانی سنانے والا اس طرح معاشرتی زندگی کی روزمرہ کی عکاسی کرتا ہے کہ معاشرتی قدریں پورے طور پر سامنے آجاتی ہیں۔

کہانی شروع کرنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے اور کہانی ختم ہونے پر بھی کہانی سنانے والا ایک مانوس جملہ بولتا ہے۔ عموماً لوگ کہانیوں کا آغاز یوں کرتے ہیں:

ا۔ واہ واہ ہے

اللہ بادشاہ ہے

ہک ہا بادشاہ

اوہاٹوٹے زمین دا بادشاہ

اصل بادشاہ تے اللہ ہے

۲۔ واہ واہ اے

دل دریا اے

کاغذاں دی بیڑی

مکوڑا ملاح اے

لوک چڑھدے پئے ہن

ساڈی صلاح اے

کویلی کر کے لمڑے ہتھ میاں

نالوں شودا ہاتھی لنگھیا

ہاتھی نوں دب کے ماریس لت میاں

آخاں ہاتھیا، ہون تائیں لتاڑی اے بھوگ میاں

ہن ملیا ای جوان نوں جوان میاں

مکوڑا چوکیدار اے

کھاون والی میری اپنی سرکار اے

رات پئی دھمے

کہانی ہن پئی جمے

لوٹا پیار ڑھے

کہانی دا مڈھ پیا چھڑے

۳۔ کھنڈ کھیری پی سائیں

جیویں جی نال

روٹی کھاویں کھنڈ کھیر نال

دشمن دی ہال دی پیڑ نال

ہک ہا بادشاہ

بادشاہ تے آپ خدا اے

پر اوہا زمین دے ٹوٹے دا بادشاہ

۴۔ قصہ سناون دا مزہ ہے تاں

جے اگوں سنن والا کرے ہاں

کہانی کا اختتام عموماًیوں ہوتا ہے۔ جب کہانی کا ہیرو کامیاب ہو جاتا ہے تو کہانی سنانے والا کہتا ہے۔

اوہ اُتھاں وسد اپیا اے

اساں اِتھاں کہانی سنیدے پئے آں

ان کہانیوں میں رنگا رنگی کے ساتھ یکسانیت بھی نظر آتی ہے یعنی بدی پر ہمیشہ نیکی کو فتح حاصل ہوتی ہے۔

سروے کے دوران جو کہانیاں ملیں وہ زیادہ تر عمر رسیدہ افراد نے سنائیں۔ کہانی سنانے کا انداز بے حد دلنشین ہوتا ہے۔ کہانی سنانے والا سننے والوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پھر مجال ہے کہ کوئی اپنی توجہ اِدھر اُدھر کرے۔ کہانی سنانے سے پہلے ایک خاص انداز میں ابتدائیہ کہا جاتا ہے اور کہانی ختم ہونے پر بھی ایک مانوس جملہ بولا جاتا ہے۔

ان کہانیوں کے موضوعات میں خیر وشر کا ٹکراؤ ہے اور ہمیشہ سچ کو فتح حاصل ہوتی ہے۔ ان کہانیوں کے موضوعات میں لوک دانش کے ساتھ ساتھ عقائد کا حوالہ اور دریا سے عقیدت بھی نظر آتی ہے۔ اُدھڑو کہانی میں اُدھڑو ایک اُدھورا انسان ہے مگر عقل ودانش بے پناہ رکھتا ہے۔ پہلے اپنی دانش سے بھائیوں کو ماسی ڈائن کے نرغے سے آزاد کراتا ہے۔ پھر جب یہی بھائی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں تو ادھڑو کیلئے کھودے گئے کنوئوں میں خود ہی گر پڑتے ہیں۔ ادھڑو محض ایک کہانی کا کردار نہیں بلکہ اس خطے کی بصیرت ودانش کا نمائندہ بھی ہے۔ اپنی ذہانت کا استعمال کرتا ہے اور ہر خطرے سے بچ نکلتا ہے۔ اس کہانی میں بعض ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب خیال آتا ہے کہ ادھڑو کو بھائیوں کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے مگر زیادتی میں ادھر او کبھی پہل نہیں کی بلکہ سوچ بچار سے ہر خطرے کا مقابلہ کرتا ہے۔

کہانی نمبر ۴ میں بادشاہ لڑائی کی امکانی صورتحال سے بچنے کیلئے بادشاہت چھوڑ دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو اس خطے کے لوگوں کے مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہر آدمی کوشش کرتا ہے کہ کوئی تلخی کی صورتحال پیدا نہ ہو۔ بادشاہ صبر سے کام لیتا ہے، دریا اور دریائی مخلوق کی مدد سے صبر کا پھل پالیتا ہے۔ دریا کے حوالے سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ دریا منصف ہے۔ وہی فیصلے کرتا ہے۔ اس کہانی میں بھی باشادہ کو انصاف دلانے میں‌دریا معتبر حوالہ ہے۔

خطے کے لوگ غیبی امداد پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کہانی میں بھی ایسے مقامات آتے ہیں جب غائب سے طاقت پہنچتی ہے۔

مقامی لوگوں کی دریا سے ایک خاص عقیدت ہے اور حضرت خضر دریائوں کے زندہ پیر اور پیغمبر مانے جاتے ہیں۔ دریائی معاملات ان کے حکم کے تابع ہیں چاہے سیلاب ہو یا دریائی کٹائو سب ان کے حکم سے ہو رہا ہے۔

لوگوں کے سینوں میں ایسی کہانیاں بھی موجود ہیں جن میں دریائی حادثات کے بعد حضرت خضر امداد کرتے ہیں اور مشکلات میں گھرے ہوئے لوگوں کی مشکل کُشائی کرتے ہیں۔ ایسی تمثیلی کہانیاں بھی ہیں جن میں دریا ایک کردار کے طور پر پر سیلابی صورتحال سے بچنے کیلئے مشورے دیتا ہے۔

ملا نصیر الدین کی طرز کے لطائف بھی ہیں جو کہانیوں کی صورت میں ملتے ہیں۔ ان کہانیوں میں جہاں مزاح کا عنصر ہے وہاں ایک پیغام بھی ہے۔ ایک کہانی مزاح میں غلام بہت زیادہ حقہ پیتا ہے۔ اسے حقہ پینے سے منع کرتے ہیں مگر غلام اس بات سے ناراض ہوتا ہے۔ بتانا مقصود یہ ہے کہ تمباکو نوشی کے مضر اثرات سے نہ صرف جدید دنیا واقف ہے بلکہ دریا کنارے بسنے والے لوگ بھی جانتے ہیں۔

کہانی نمبر ۳ میں ایک خاص انداز میں اخلاقی سبق موجود ہے کہ کسی کو ناجائز تنگ نہ کرو ورنہ اپنا ہی نقصان ہو گا۔ ایک چھوٹی سی چڑیا کس طرح بادشاہ سے بدلہ لیتی ہے۔ سچائی کو کسی طاقت سے دبایا نہیں جاسکتا۔

گویا ان کہانیوں کے موضوعات میں جھوٹ سچ کی جنگ اور اس میں سچ کی فتح، قناعت پسندی اور صبر کا پھل میٹھا اور ذہانت کا مالک سالم آدمی ہی نہیں بلکہ ادھڑو بھی ہو سکتا ہے۔

ان کہانیوں کے کردار اس خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کرداروں کے ناموں میں مقامیت پیدا کی گئی ہے، تاکہ کہانی سنتے ہوئے اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ ادھڑو، غلام، ملاح، ماسی ڈائن، پائولی، جٹ، سپاہی ایسے کردار ہیں جو اس خطے کے لیے نامانوس ہیں۔

یہ کردار اسم بامسمیٰ کے طور پر بھی آئے ہیں۔ ان کرداروں کی نفسیات بھی مقامی فضا سے میل کھاتی ہے۔ کہیں پر بھی کردار اپنی شناخت نہیں کھوتے۔

ادھڑو کا کردار ایک چالاک اور موقع شناس کردار ہے۔ جو خطرات میں گھبراتا نہیں بلکہ ان خطرات سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایک فنکارانہ صلاحیت کا مالک ہے۔ ماسی ڈائن کا کردار خطے کے لوگوں کے لیے نامانوس نہیں۔ لوگ ایسی مخلوقات پر یقین رکھتے ہیں جو ہر لمحہ نقصان پہنچانے کیلئے تیار ہیں۔ پائولی کا کردار ایک بیوقوف کردار کے طور پر سامنے آیا ہے۔ یہ بھولا بھالا کردار چالاکی جیسی خصوصیات سے کوسوں دور ہے۔

غلام کا کردار اپنے آپ کو تبدیل کرنے کیلئے تیار نہیں۔ وہ تمباکو نوشی کی عادت کو ترک کرنے کیلئے تیار نہیں۔ چاہے اس کے ساتھ جو بھی ہو جائے۔

ملاح صبح کو روزی کی تلاش میں نکلتا ہے اور کئی مصیبتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ملاح کی زندگی خطرات سے پُر ہے۔ کہانیوں کے ان کرداروں میں جانور اور پرندے بھی ہیں۔ پرندے بھی باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چڑیا کے طنز آمیز جملے بادشاہ کو غصہ دلاتے ہیں اور کشمکش کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے، مگر مچھ بادشاہ کو دوبارہ بادشاہت دلانے کا وسیلہ بنتا ہے۔

ان کہانیوں میں خطے کا جغرافیہ پورے طور پر موجود ہے۔ کہانی کا پلاٹ خطے کی فضا میں تشکیل دیا گیا ہے۔ کہانیوں میں جابجا ایسی جزئیات ہیں جن سے مقامیت نظر آتی ہے۔ اکثر کہانیوں میں دریا کا حوالہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ دریائی مخلوق کو بھی کہانیوں کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ملاح اور کشتی کا ذکر کہانی کی فضا کو لوگوں کے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔ علاقے کے پرندوں اور جانوروں کا ذکر بھی کہانی میں موجود ہے۔

ترجمہ ہونے کے بعد کہانیوں کا اُسلوب نہایت سادہ ہو گیا ہے۔ اصل متن میں کہانی زیادہ تاثر ابھارتی ہے۔ جملوں کی ساخت اور کہانی سنانے والے کا انداز کہانی کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

جھنگ کے علاقے میں لوگوں کا کہانی سنانے کا انداز زیادہ دلکش تھا۔ شاید معاشی طور پر خوشحال لوگ کہانی سننے اور سنانے کے فن سے زیادہ آشنا ہوتے ہیں۔ ان کہانیوں کے بارے میں حتمی طور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتنی پرانی ہیں کیونکہ یہ کہانیاں صدیوں کا سفر طے کر کے آج کے زمانے میں پہنچی ہیں۔ یہ کہانیاں کسی ایک ذہن نے تخلیق نہیں کی ہوں گی بلکہ مختلف ادوار اور مراحل میں مکمل ہوئی ہوں گی۔ اب بھی تبدیلی کا عمل جاری ہے۔ کہانیوں میں جدید زمانے کی چیزوں کے نام بھی استعمال ہوئے ہیں۔ کہانی نمبر ۲ میں سپاہی کا کردار جدید نظام اور زمانے کی نشاندہی کر رہا ہے۔

کہانی نمبر ۲ میں بحری جہاز اور کہانی نمبر ۳ میں بندوق اور فائر جیسے الفاظ اتنے زیادہ پرانے نہیں۔ کہانی ہر لمحہ تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے اور زمانی تبدیلی کے اثرات کو قبول کر رہی ہے۔

بجلی کے آنے سے گھروں میں ٹیلی وژن بھی موجود ہیں۔ رات کو بچوں کی بڑوں سے کہانی سننے کی تکرار ٹیلی وژن آنے سے بہت کم ہو گئی ہے۔ میڈیا کے اثرات نے کہانی سنانے اور سننے والے مزاج کو کسی حد تک تبدیل کر دیا ہے۔

ان کہانیوں کو محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کہانیوں میں بے پناہ دانش، علاقے کا جغرافیہ اور ثقافت موجود ہے۔ یہ کہانیاں محض فرضی قصے نہیں اور نہ ہی بے مقصد اور خیالی باتیں بلکہ ان کہانیوں میں قدیم لوگوں کی سوچ اور ان کے ادبی رجحانات، خیالات، روایات اور رسم ورواج، رہن سہن، توہمات، خواہشات اور خوف کے بارے میں ہم جان سکتے ہیں۔

لوک گیت:

لوک گیت ہماری زندگی اور ثقافت کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔ ان میں ہماری زندگی کا اصل روپ دکھائی دیتا ہے۔ محبت اور تعلق کے جذبے اپنی پوری شدت کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ لوک گیت ہماری دھرتی کا اصل سرمایہ ہیں جن میں ہمیں اپنا اور اپنی دھرتی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ یہ گیت کسی انفرادی ذہن کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ ساری قوم کی ملکیت ہوتے ہیں اور ان گیتوں نے کسی ایک زمانے میں جنم نہیں لیا بلکہ ہر دور

میں لوگوں کے مزاج اور نفسیات کو اپنے اندر سموتے رہے ہوں گے اور پھر کہیں جا کر یہ گیت اظہار کی صورت میں آئے ہوں گے، لوک گیت اس دور میں کہے جاتے رہے ہوں گے جب انسان نے لکھنا نہیں سیکھا ہو گا اور یہ گیت سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہے ہوں گے۔

یہ گیت علاقے میں بسنے والے لوگوں کی سوچوں اور خیالات کے شاہکار ہیں جو اپنے علاقے کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا بھرپور اظہار ہے۔ لوک گیتوں میں سچے اور کھرے جذبے نہایت سادگی سے بیان ہو جاتے ہیں۔ ان میں علاقے کی فطرت اور چیزوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان گیتوں میں خطے کی رسموں، رواجوں، فصلوں، تہواروں اور جغرافیہ کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔ اِن گیتوں کی مدد سے ہم خطے کے لوگوں کی نفسیات، رجحانات اور میلانات سے واقفیت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

سروے کے لیے انتخاب کے لیے گئے علاقے میں لوک گیتوں کی گائیکی میں جو سب سے زیادہ اصناف مقبول ہیں ان میں ماہیا اور ڈھولا ہے۔ ڈھولے اور ماہیے نہ صرف شادی یا دیگر خوشی کے تہواروں پر گائے جاتے ہیں بلکہ ان میں وسیب کا دُکھ، ذاتی غم اور عبد و معبود کے تعلق کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

ماہیا:۔

ماہیا ایک مختصر سی صنف ہے جس میں عشق و محبت سے لے کر معرفت کے مضامین کو تین مصروں میں بیان کیا جاتا ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ ماہیے کا پہلا مصرع محض قافیے کی ضرورت کے لیے آتا ہے اور اس کا اگلے دو مصرعوں کے ساتھ کوئی موضوعاتی تعلق نہیں ہوتا یہ بات کسی حد تک ٹھیک ہے مگر پہلے مصرع کا دوسرے دونوں مصرعوں سے موضوعاتی تعلق نہ ہونے کے باوجود بھی اس میں ایسی چیزوں کا ضرور بیان ہوتا ہے جو ارد گرد کے ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس مصرع میں خطے کی اشیائ، جغرافیہ اور نفسیات کا حوالہ ضرور ہوتا ہے۔ ماہیا کسی بھی علاقے کی ثقافت کا ترجمان ہوتا ہے اور اس میں خطے کی رسومات، لہجے اور زبان کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔ یہ اس خطے کی بہت ہی مضبوط صنف ہے جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہی ہے۔

۱۔ سپ پانی وچ تر جاندا
عشق دی سَٹ کھا کے
او بندہ جیندیاں مر جاندا

۲۔ کالا کاں ہوسی
نے دھمی اساں ٹر جاناایں
تیری سر تے بانہہ ہوسی

۳۔ لال رضائی ہووے

اوہ قسم چوا سکنا ایں

اسیں عید منائی ہووے

۴۔ کوئی لال پرانده اے

اوئے اک واری معاف جا کر

بنده بھل وی تے جاندا اے

ڈھولا:۔

یہ لوک گیت کی ایک پرانی صنف ہے۔ جھمر، ناچ کے ساتھ ڈھولے کے کئی روپ ملتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں کئی رنگ ملتے ہیں۔ڈھولا اکثر دو مصروں سے لے کر کئی کئی سطروں تک گایا جاتا ہے۔

ترقی اُردو بورڈ کراچی کی ترتیب دی گئی لغت میں ڈھولے کی وضاحت یوں ہے۔

"پنجابی لوگ جو ماہیہ ٹپہ کی طرز کا ہوتا ہے اور شادی بیاہ یا خوشی کے موقع پر گیا جاتا ہے۔"[۱۱]

جبکہ وارث سرہندی جو لغت ترتیب دی ہے اس میں اس طرح درج ہے۔

"کھیت اور زمین کی سرحد دکھانے کا نشان اونچے سروں میں گایا جانے والا ایک گیت محبوب، پیارا عاشق۔"[۱۲]

ڈھولا ناچ کے بغیر بھی گایا جاتا ہے اور اس میں کہانی بھی پیش کی جاتی ہے۔علاقے کے سورمائوں کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ جھنگ کے علاقے کا مشہور لوک گیت ہے۔لوگ محفل کی صورت میں بیٹھتے ہیں اور اچھی سر والا ڈھولا الا پتا ہے۔باقی لوگ "جیویں" کی آواز نکالتے ہیں گویا اس کی آواز کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں۔ڈھولا کہنے والا اپنا ایک ہاتھ کان پر رکھ کر جب سر نکالتا ہے تو ایک گداز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بین اور ڈھولے کی لَے تقریباً ایک ہی ہوتی ہیں۔ناچ کے بغیر جو ڈھولے کہے جاتے ہیں ان میں مصرعے بڑے چھوٹے ہوتے ہیں لیکن ہر مصرع کا اختتام مخصوص قافیے پر ہوتا ہے۔

دھیدن چھڈیا تخت ہزارہ پتن تاں آملیا سوں جھنگ دے

چکوی چکوے دا میل نہ ہویا اوہ بھوترے مر گئے اتے واہندے دی کھتب دے

بازی لئی کھیڈ کھڈ کاریاں تے گوہٹی بھوندی رہ گئی وچ شطرنج دے

سوہنی گھڑتے ٹھل گئی اوہ لیکھ بھوگیندی گئی متھے دے انگ دے

تے مجنوں سُک کے مُڈھی ہویا سکے ٹانویں بنیاں ایں جا کے جنڈ دے

شیریں لٹکی رنگ محل توں فرہاد پتھر چوٹ گیا پنج ند دے

مینوں ایرے دسدے رہ گئے ٹر گیاں سجناں دی کند دے

شادی بیاہ کے گیت:۔

اس خطے میں شادی کے اپنے رسم رواج ہیں اور شادی سے کئی روز پہلے شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں اور گیت گانے اور جھومر کھیلنے کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جھومر کو مقامی زبان میں جھمر یا دھریس مارنا بھی کہتے ہیں۔ دولہا کی بہن ایک چھری جو کہ کپڑے اور موتیوں سے سجی ہوتی ہے۔ دولہا کو پیش کرتی ہے اور دولہا شادی کے اختتام تک اسے اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ مقامی لوگ اس کی توضیح اس طرح پیش کرتے ہیں کہ خوشی کے موقع پر جادو ٹونے اور بلائوں کا خطرہ رہتا ہے اگر ہاتھ میں لوہا یا تیز دھار آلہ ہو تو ان تمام آفات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

جب بارات دُلہن کے گھر آتی ہے تو دولہا کو دیسی گھی کی چوری کھلائی جاتی ہے۔ نینگر (دولہا) دلہن کے گھر جا کر نہاتا ہے اور دلہن کے گھر کی طرف سے مہیا کیے گئے نئے کپڑے پہنتا ہے اس رسم کو "کھارا" کہتے ہیں۔اس موقع پر یہ گیت گایا جاتا ہے:

تیرے کھارے داویلا اُٹھی جاگ بنرا

وڈا ویلا وے سویلا جیویں مان پھنی دا

تیڑے چیکوں داویلا اٹھی جاگ بنرا

تیڑے دھاون داویلا اُٹھی جاگ بنرا

لوک گیتوں میں زیور:۔

جسم کی خوبصورتی کے لیے انسان صدیوں سے زیور استعمال کرتا آرہا ہے۔ سونے اور چاندی کی دھاتوں سے پہلے بھی انسان مختلف طریقوں سے اپنی آرائش کا سامن کرتے تھے۔ ان پرندوں کے چمکیلے پر جانوروں کی ہڈیاں اور سیپیاں وغیرہ شامل تھیں۔ جیسے جیسے لوگ ترقی کرتے گئے۔ زیوروں کی شکلیں بھی بدلتی رہی۔لوک گیتوں کے اندر جہاں خطے کی ثقافت جھلکتی ہے وہاں لوگوں کی خواہشات بھی نظر آتی ہیں۔ عورت کو ہمیشہ زیور سے خاص لگائو رہا ہے۔ شادی کے موقعوں پر گائے جانے والے گیتوں میں یہ خواہش زیوروں کی طلب کی صورت میں سامنے آتی ہے اور عورت گیتوں کے اندر اپنی فرمائش بھی کرتی جاتی ہے۔ رنگ پور کے نزدیک سے ملنے والا ایک لوک گیت ملاحظہ ہو۔

آمل فرید ڈھولا جندڑی وچیندی آں میں

ہسی گھڑ اڈھے توں، مہراں لویندی آں میں

آمل فرید ڈھولا جندڑی وچیندی آں میں

ٹکا گھڑ اڈھے توں، بندی لویندی آں میں

آمل فرید ڈھولا جندڑی وچیندی آں میں

والیاں گھڑا اڈھے توں گھنگھریاں لویندی آں میں

آمل فرید ڈھولا جندڑی وچیندی آں میں

کوکا گھڑا اڈھے توں، نتھلی گھڑیندی آں میں

بچوں کے لوک گیت:۔

پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور وہ پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جیٹھ ہاڑ کے دنوں میں جب گرمی عروج پر ہو اور ہر کوئی بارش کے انتظار میں ہو تو بڑی عمر والے لوگ حسرت سے آسمان کی طرف منہ کر کے بادلوں کے ٹکڑوں کو تلاش کرتے ہیں۔ مگر کہیں بادل دکھائی نہیں دیتے جبکہ بچے اپنے انداز میں بارش کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ کپڑے کا ایک گڈا اور گڈی بناتے ہیں ان کی شادی کرتے ہیں اور پھر آگ لگا کر جلا دیتے ہیں اور یہ گیت گاتے ہیں۔

گڈا گڈی ساڑیا

اللہ مینہ وساریا

گڈی گل رسیاں

مینہ مارے دھرسیاں

گڈی گل ہار

مینہ ہووے تار

لوری:۔

شور کوٹ کے دریائی علاقے میں لوری دینے کا خاص انداز ہے۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ اس خطے میں ایک رسم ہے جس کا نام "پینڈا کی رسم ہے"۔ یہ رسم حضرت سخی سرور کے عرس سے کچھ دن پہلے شروع ہوتے ہیں۔ ملنگوں کا ایک ولہ دریا کے کنارے چلتا ہے جس کو مقامی لوگ سنگ بولتے ہیں۔ یہ ملنگ دریا کنارے چلتے ہیں۔ قریبی آبادیوں کی عورتیں نئے کپڑے پہن کر دریا کی طرف چلتی ہیں۔ یہ عورتیں پینڈا کرتی ہوئیں دریا پر پہنچتی ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں جا سکتا۔ صرف تین سال سے کم عمر کا لڑکا ہو سکتا ہے۔ ملنگ ان کم عمر لڑکوں کو لوری دیتے ہیں جبکہ عورتیں پیسے وارتی ہیں اور چوری ملنگوں کو دی جاتی ہے۔

لوری کے بول کچھ یوں ہوتے ہیں:

میں بھنی آئی ہاں

ہتھ پھدایا گاچا، تینوں لوری دیوے چاچا

میں بھنی آتی ہاں

ہتھ پھدایا گانا تینوں لوری دیوے نانا

میں بھنی آئی ہاں

ہتھ پھدائی کپی تینوں لوری دیوے پھوپھی

میں بھنی آئی ہاں

ہتھ پھدایا کانا، تینوں لوری دیوے ماما

میں بھنی آئی ہاں

کہاوتیں:

پنجابی، سرائیکی اور جھنگوی لہجے میں اس کو اکھان کہتے ہیں جبکہ اُردو میں ضرب المثل یا مثل اور انگریزی میں Proverb کہا جاتا ہے۔

اکھان یا ضرب المثل میں ایک ایسا سچ ہوتا ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کیونکہ ان میں لوگوں کے تجربات، ان کی دانش اور زندگی کے اسرار و رموز کا بیان ہوتا ہے۔ اس میں مقامی ثقافت کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اکھان میں لفظ کم ہوتے ہیں مگر جامعیت ہوتی ہے۔ جہاں کسی بات کو سمجھانے کے لیے ایک لمبی تقریر کی ضرورت ہوتی ہے وہاں موقع کی مناسب سے بولا گیا ایک اکھان ان تمام باتوں کا احاطہ کر لیتا ہے، ہر اکھان کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے جو ماضی میں وقوع پذیر ہو چکی ہوتی ہے۔ جس طرح لوک گیت یا لوک کہانیاں مختلف زبانوں سے گزر کر لوک ادب کا حصہ بنتی ہیں۔ اسی طرح اکھان بھی ایک ذہن یا ایک زمانے کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ برس ہا برس کے تجربات کے بعد اپنی مستقل حیثیت بناتے ہیں اور پھر ان کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

یہ اکھان لوک دانش کا بہترین اظہار ہوتے ہیں۔ تحریر کے اندر محاورہ جذب ہو کر گم ہو جاتا ہے۔ مگر اکھان تحریر کے اندر اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں۔ سروے کے دوران جو اکھان ملے ان میں علاقے کا جغرافیہ، لوگوں کی نفسیات اور لوک دانش کا سرمایہ مضمر ہے۔ یہ اکھان زیادہ تر عمر رسیدہ افراد کی گفتگو میں سامنے آئے۔ وہ اکثر اپنی گفتگو میں اکھان کا استعمال کرتے ہیں جبکہ نوجوانوں کے ہاں اس کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔

۱۔ پانہ پڑھی بھج مسیتے وڑی

ترجمہ: پڑھا نہ لکھا نام محمد فاضل

۲۔ بی بی وسے قاسم بیلا

دل فرید آباد

ترجمہ: لڑکی بیاہ کر سسرال آجاتی ہے مگر اس کی محبت میکے ہی کی طرف رہتی ہے جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا ہوتا ہے۔ یہ کہاوت عموماً اس وقت بولی جاتی ہے جب کوئی بندہ جسمانی طور پر کہیں اور ذہنی طور پر کہیں اور ہو۔

۳۔ پرائی شادی احمق نچے، مجولا کے ویلاں گھتے

ترجمہ: بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ

۴۔ ذات دی کوہڑ کرلی چھتیر اں نوں جپھے

ترجمہ: چھوٹا منہ بڑی بات

پہیلیاں:

کسی قوم کے علمی مزاج سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس قوم کی تاریخی روایات اور ادبی و تہذیبی قدروں کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس سے قوم یا خطے میں بسنے والے لوگوں کے تہذیبی اور فکری رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ ہر خطے میں بولی جانے والی زبان، وہاں کے لوگ گیت، لوک کہانیاں، کہاوتیں اور پہیلیاں وہاں کے لوگوں کا ادبی و فکری رنگ و روپ سامنے لاتی ہیں۔ پہیلی اُردو زبان کا لفظ ہے جسے پنجابی اور سرائیکی میں "بجھارت"، سندھی میں "گجھارت"، پشتو میں "اڑ"، فارسی میں "چیستاں"، عربی میں "لغز" جبکہ انگریزی میں کونڈ کہتے ہیں۔

علاقے میں آج بھی بجھارتوں کا رواج ہے۔ بچے اب بھی والدین سے بجھارتیں سنتے ہیں۔ بجھارتیں خطے کا علمی و تاریخی ورثہ ہیں۔ پہیلیوں کا رواج کیوں مقبول ہوا اور اس کی ضرورت کیوں تھی۔ دو باتیں فوری سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو اولاد کے ذہن کو تیز کرنا، دوسرا شام کے بعد ان کی دلچسپی کا سامان پیدا کرنا تا کہ بچوں کے گھروں میں باہر جانے کے خطرات کو کم کیا جائے۔ بجھارتوں کا جواب لینے کے لیے لالچ بھی دیا جاتا ہے۔ لالچ مادی صورت میں نہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی نے جواب تلاش کر لیا تو وہ عقلمند، بادشاہ یا وزیر کہلائے گا اور بعض اوقات خوف کی فضا بھی پیدا کی جاتی ہے کہ اگر جواب نہ دیا تو تمہارا حلیہ جانوروں یا حیوانوں جیسا ہو جائے گا اس طرح مخاطب خوف اور لالچ کی وجہ سے دماغوں پر خوب زور دیتے ہیں۔

جس طرح کہانیاں سنانے کے لیے رات کا وقت مقرر ہے۔ اس طرح پہیلیوں کے لیے بھی یہی وقت ہوتا ہے۔ اگر بچے دن کو ضد کریں تو انہیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے۔ کہ اگر تم دن کو پہیلیوں کی ضد کرو گے تو مسافر رستہ بھول سکتے ہیں یہ سن کر بچے سہم جاتے ہیں اور رات کا انتظار کرتے ہیں۔

عموماً پہیلیوں میں ایسے جوابات مانگے جاتے ہیں جن کا اِرد گرد کے ماحول سے تعلق ہوتا ہے اور پہیلی کے اندر بھی خطے کی اشیا اور جغرافیہ کا بیان ہوتا ہے، پہیلی اور اس کا جواب نامانوس نہیں ہوتے۔ بس تعلق اور ربط تلاش کیا جاتا ہے۔ خطے میں موجود چیزوں کے ساتھ لوگوں کی وابستگی کو ملحوظِ خاطر رکھ کر پہیلی کہی جاتی ہے۔ ایک پہیلی میں کشتی کے لیے ماں، سوار کے لیے بچے اور دریا کے لیے بزرگ کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

ان پہیلیوں میں عقیدے، علاقے کے جانوروں، پرندوں، اشیاء اور جغرافیے کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ پہیلیوں کو ایک ترتیب سے تحریر کیا گیا ہے تاکہ پتا چل سکے کہ علاقہ تبدیل ہونے پر لہجہ اور الفاظ کس طرح تبدیل ہو رہے ہیں۔ بعض پہیلیاں تقریباً ایک ہی ہیں، لیکن ان کی زبان اور لہجہ مقام بدلنے سے تبدیل ہو جاتا ہے۔

اب سروے کے لیے انتخاب کیے گئے علاقے کی کچھ پہیلیاں پیش ہیں۔ جو اس خطے کے تفریحی ادب کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

۱۔ یاروں آیا ماماں گھماں

سر بھنا کے پچھاں بھنا (کپاس کا بنولہ اور بیلنا)

۲۔ لقمان حکیم حکمت ٹھیک

تلّا پاک تے منہ پلیت (کستی)

۳۔ لماں لم سلماں

اماں چائے بال بچے

تے بابے چالئی اماں (کشتی، سوار، دریا)

۴۔ پاروں آئے مست ملنگ

ساویاں ٹوپیاں کالے رنگ (بینگن)

۵۔ اجھڑ لنگ گئے

پیرا کائی نئیں (شہد کی مکھیاں)

۶۔ نکی جئی ڈولی

ملتان ونج بولی (چٹھی، خط)

۷۔ چٹی ککڑ چٹے بچے

پیو دے آندے تائیں

ہک نہ بچے (سورج، چاند، ستارے)

۸۔ اُچے ٹبے اُٹھ ارڑاوے

اوہدی کھٹی ہر کوئی کھاوے (آٹا پیسنے والی چکی)

۹۔ نانگ جھت وچ

جنوبی پنجاب میں دریائے چناب کے کنارے آباد لوگوں کے زبانی ادب کو محفوظ کرنے کے لیے کوئی بھی ادارہ اپنا فعال کردار ادا نہیں کر رہا ۔لوک ورثہ جس سرد مہری کا شکار ہے وہ اہلِ علم کے لیے لمحہ ٔفکریہ ہے۔ بے روزگاری اور بھوک کے خطرات عام آدمی کو اجازت نہیں دیتے کہ اپنی لوک ثقافت سے رشتے مضبوط کرے اور اس میں اپنا حصہ ڈالے۔ ان چیزوں کو محفوظ کرنے میں جو چیز رکاوٹ بنتی ہے۔ وہ قدیم اور جدید نسل میں پایا جانے والا فرق ہے۔ اس سبب بہت سی روایات متاثر ہو رہی ہیں اور یہ روایات سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کی بجائے ختم ہو رہی ہیں۔ اس ادبی سرمائے کو محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو میڈیا کی یلغار کے سامنے اس کا ٹھہرنا ممکن نہیں۔ جس معاشرے میں لوگوں کی توقیر نہ ہو وہاں ان کی روایات سے بھی چشم پوشی کی جاتی ہے۔ کسی قبیلے یا انسان کو جو سب سے زیادہ چیز عزیز ہوتی ہے وہ اس قبیلے کی صدیوں پرانی روایات ہیں اور لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر اُن روایات میں بندھے نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میڈیا کی تیز رفتاری کی وجہ سے ہمارا قیمتی ثقافتی ورثہ نظروں سے اُوجھل ہو جائے اِس کو محفوظ کر لینا چاہیے ورنہ آنے والے وقتوں میں نئ نسل کے لیے زندگی بھی نئ ہو گی۔

حوالہ جات

1. M. S. Krishna: "Geology of India and Burma", Madras, 1960,P.35

۲۔ اولاد علی گیلانی، سیّد: "مرقع مولتان"، جاذب پبلشرز لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۔ ۱۰۰

.۳ James Douie, Sir, "The Punjab North-West Frontier Province and Kashimir", Low Price Publication, Dehli1994,P.41

۴۔ ابو الفضل، علامہ: "آئینِ اکبری" (مترجم) مولوی محمد فدا علی صاحب طالب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد، ص۔ ۱۰۳۷

۵۔ احمد غزالی: "ساندل بار"، فیروز سنز لاہور، بار اوّل، ۱۹۸۸ء، ص۔ ۴۳۔

6. David Ross: "The Land of the Five Rivers and Sindh", Al-Biruni Printers, Lahore, 1976, P.141

7. Nundo Lal, Dey: "The Geographical Dictionary of Ancient and Mediaeval India", Low Price Dehli, 1994 Publications,

۸۔ ابنِ حنیف: "سات دریاؤں کی سرزمین"، فکشن ہاؤس لاہور، ۱۹۹۷ء، ص۔ ۲۲۲

۹۔ ایضاً، ص۔ ۲۲۲

۱۰۔ "پہلی بات"، ڈاکٹر اسلم انصاری، چندر آب، شمارہ ۰۲-۲۰۰۳ء، بہاء الدین زکریا یونیوسٹی، ملتان۔

۱۱۔ اردو لغت (تاریخی اُصول پر) اردو لغت بورڈ (ترقیٔ اردو بورڈ کراچی)، جنوری ۱۹۹۰ء، ص۔ ۲۵۲

۱۲۔ علمی اردو لغت از وارث سرہندی ایم۔ اے، علمی کتاب خانہ لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۔ ۷۸۸